تحریر خورشید ندیم

ایک علمی روایت کا خاتمہ

۳۱ دسمبر کی شب جب بیسویں صدی رخصت ہوئی تو اسکے ساتھ علم و فضل کا وہ چراغ بھی بجھ گیا جو برصغیر پاک و ہند کی مشترکہ اور روشن علمی روایت کا آخری امین تھا۔ ایک طرف ماہ و سال کے پیمانے سے ایک عہد کا خاتمہ ہوا اور دوسری طرف فکر و نظر کا ایک دور اپنے اختتام کو پہنچا۔ اس رات ندوۃ العلماء کے عظیم فرزند مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنے پروردگار کے حضور جا پہنچے جہاں ہم سب کو ایک معین وقت پر حاضر ہونا ہے۔

نظری اعتبار سے انیسویں صدی کو مغرب میں "افکار کا دور" Age of Idealogy کہا گیا ہے۔ کانٹ، کومٹے، مل، سپنسر، نطشے، شوپن ہائر، ہیگل، مارکس صاحبتان فکر و نظر کی ایک کہکشاں ہے جو اس صدی کے آسمان پر بکھری ہوئی ہے اس عہد میں فلسفہ تاریخ کو علم کی دنیا میں یہ مقام ملا کہ انسان کی قسمت سازی میں وہ ایک بڑا عامل قرار پایا۔ دنیا مارکس کی جدلیاتی مادیت Dialactical Materialism نطشے کے "سپرمین" اور فلسفہ جرمنی کے تصور خودی Egoism سمیت ان گنت نئی فکری تعبیرات سے آشنا ہوئی۔ بالکل اسی طرح بیسویں صدی میرے نزدیک مسلم فکر کے حوالے سے افکار کا دور Age of Muslim Idealogy ہے۔ ایک طرف مصر میں محمد عبدہ، رشید رضا، حسن البناء سید قطب شہید اور محمد الغزالی جیسے حضرات نے علم و عرفان کا چراغ روشن کیا اور دوسری طرح ایران و عراق کی سرزمین پر ابوالقاسم الخوائی، باقر الصدر، مرتضیٰ مطہری اور علی شریعتی جیسے لوگوں کا غلغلہ بلند ہوا۔ انڈونیشیا میں محمن ناصر اور شمالی افریقہ میں مالک بن نبی جیسے صاحبان علم کا ظہور ہوا۔ برصغیر کا معاملہ تو سب سے منفرد رہا۔ سر سید احمد خان، شبلی نعمانی، علامہ اقبال، حمید الدین فراہی، ابوالکلام آزاد، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور امین احسن اصلاحی جیسے جلیل القدر لوگ پیدا ہوئے جنکے افکار نے آج بھی ایک زمانے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ سر سید احمد خان اگرچہ ۱۸۹۸ء میں دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن انکے افکار نے بیسویں صدی کے برصغیر کو

غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ اسی وجہ سے ہم انکا شمار بیسویں صدی کے مفکرین میں کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کانٹ کا انتقال تو انیسویں صدی کے اوائل ۱۸۰۴ میں ہو گیا تھا لیکن وہ بجا طور پر اس صدی کے مفکرین میں شمار ہوتے ہیں۔

بر صغیر میں جنم لینے والی فکری روایت میں ایک نام مولانا ابوالحسن ندوی کا بھی ہے جو علی میاں کے نام سے معروف ہیں۔ یہاں ایک متوازن دینی فکر کے فروغ میں ندوۃ العلماء کا اپنا حصہ ہے ندوہ نے جو بڑے لوگ پیدا کئے ہیں ان میں ایک علی میاں بھی تھے۔ اپنے علم و فضل اور حسن سیرت کے اعتبار سے وہ فی الواقعہ ہمارے اسلاف کی نشانی تھے۔ وہ علماء کے اس کردار کی عملی تصویر تھے جسکا ذکر قرآن مجید نے کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ساری عمر ایک داعی اور نذیر بن کر جئے۔ انہوں نے انداز کی وہ ذمہ داری حسن و خوبی سر انجام دی جس کا تذکرہ سورہ توبہ (22:9) میں تفقہ فی الدین رکھنے والوں کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ مولانا نے تمام عمر ایک غیر مسلم ریاست میں گزاری لیکن وہ پوری امت کیلئے فکر مند رہے اور ہر جگہ کے مسلمانوں کے درد کو انہوں نے اپنا درد سمجھا۔ اس میدان میں بلاشبہ انکا کوئی ثانی نہیں تھا۔ وہ مسلمان حکمرانوں سے مخاطب ہوتے تو یہ درد انکے الفاظ میں ڈھل جاتا۔ کوئی اس درد کو محسوس کرنا چاہے تو انکے ایسے خطوط کو پڑھ لے جو انہوں نے عرب دنیا کے ارباب اقتدار کو لکھے یہ خطوط اردو میں بھی حجاز مقدس اور 'جزیرہ العرب' کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ جس متانت اور وقار کے ساتھ اپنی بات کہتے اسکا اندازہ ایک واقعہ سے کیا جاسکتا ہے جو ایک محترم دوست اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے استاد ڈاکٹر محمد الغزالی نے سنایا اور جسے ایک سعودی عالم نعمان ثمر قندی نے روایت کیا وہ کچھ عرصہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں استاد بھی رہے۔ نعمان ایک ملاقات کا حال بیان کرتے ہیں جب علی میاں شاہ فیصل شہید سے ملنے کیلئے تشریف لے گئے مولانا شاہی محل کے کمرہ ملاقات میں داخل ہوئے تو بہت دیر تک اسکی چھت اور در و دیوار کی طرف حیرت اور استعجاب کیساتھ دیکھتے رہے، شاہ فیصل نے اسکا سبب پوچھا تو مولانا گویا ہوئے "میں نے بادشاہوں کے دربار کبھی نہیں دیکھے، آج پہلا تجربہ ہے اسلئے محو حیرت ہوں میں جس سرزمین سے تعلق رکھتا ہوں، وہاں اب بادشاہ نہیں ہوتے لیکن

تاریخ کا ایک دور ایسا بھی تھا جب وہاں بھی بادشاہ حکومت کرتے تھے۔ میں نے تاریخ میں ایسے بہت سے لوگوں کا بارہا تذکرہ پڑھا ہے آج اس دربار میں آیا ہوں تو ایک تقابل میں کھو گیا ہوں.....''

جو لوگ مولانا کے عربی زبان کے ذوق سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں علی میاں ایسی فصیح و بلیغ زبان لکھتے اور بولتے تھے کہ اہل عرب بھی اس کے سحر میں کھو جاتے، عرب بہت کم کسی کی عربی دانی کا اعتراف کرتے ہیں۔ علی میاں ہمارے عہد کے شاید واحد عجمی ہیں جنکی فصاحت وبلاغت کو وہ رشک بھری نظروں سے دیکھتے تھے مجھے خیال ہوتا ہے کہ مولانا اگر عہد جاہلیت میں ہوتے تو عرب کے فصحا انکی زبان دانی کے اعتراف میں انکو سجدہ کرتے، انکی یہی فصاحت تھی جس نے شاہ فیصل کو مبہوت کر رکھا تھا۔ اور وہ ہمہ تن گوش مولانا کے سامنے کھڑے تھے۔ مولانا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''میں سوچ رہا ہوں کہ ہمارے ہاں بھی ایک بادشاہ گزرا ہے، آج کا بھارت، پاکستان، سری لنکا، برما، نیپال دور دور تک اسکی حکومت تھی اس نے اپنے باون سالہ عہد اقتدار میں بیس برس گھوڑے کی پیٹھ پر گزارے اسکے دور میں مسلمان آزاد تھے، خوشحال تھے، انکے لئے آسانیاں تھیں لیکن بادشاہ کا حال یہ تھا کہ وہ پیوند لگے کپڑے پہنتا تھا۔ وہ قرآن مجید کی کتابت کر کے اور ٹوپیاں بنا کر گزر اوقات کرتا۔ رات بھر اپنے پروردگار کے حضور میں کھڑا رہتا اور اسکے دربار میں اپنے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتا اس وقت مسلمان حکمران غریب اور سادہ تھے، اور عوام خوشحال اور آسودہ، آج آپکا یہ محل دیکھا تو خیال آیا کہ سب کچھ کتنا بدل گیا ہے۔ آج ہمارے بادشاہ خوشحال ہیں اور بڑے بڑے محلات میں رہتے ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں کا یہ حال کہ وہ فلسطین میں بے گھر ہیں، کشمیر میں انکا لہو ارزاں ہے، وسطی ایشیاء میں وہ اپنی شناخت سے محروم ہیں۔ آج میں نے آپ کے محل میں قدم رکھا تو اس تقابل میں کھو گیا''۔ راوی کا بیان ہے کہ جب علی میاں خاموش ہوئے تو شاہ فیصل کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا۔ اب انکی باری تھی۔ پہلے انکے آنسو نکلے پھر ہچکی بندھ گئی۔ اسکے بعد وہ زار زار رونے لگے وہ اتنی بلند آواز سے روئے کہ انکے محافظوں کو تشویش ہوئی اور وہ بھاگتے ہوئے اندر آگئے۔ شاہ فیصل نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے باہر جانے کو کہا، پھر مولانا سے مخاطب ہو کر بولے ''وہ بادشاہ اسلئے ایسے تھے کہ انہیں آپ جیسے ناصح میسر تھے، آپ تشریف

لاتے رہیں اور ہم جیسے کمزور انسانوں کو نصیحت کرتے رہیں" اس ملاقات میں شاہ فیصل نے ندوۃ العلماء کیلئے ایک خطیر رقم پیش کرنا چاہی، لیکن مولانا نے انکار کر دیا اور کہا کہ ندوہ کے معاملات اللہ تعالیٰ کی عنایت سے بہتر طور پر چل رہے ہیں۔

علی میاں ایسے شائستہ اطوار تھے کہ انکے معاصرین میں کم لوگ انکی مثل ہونگے۔ وہ ایک دور میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے متاثر ہوئے اور جماعت اسلامی کے رکن بن گئے۔ لیکن جلد ہی علیحدگی اختیار کرلی۔ افتاد طبع کے اعتبار سے وہ ایک زاہد اور عبادت گزار آدمی تھے۔ اسلئے انہیں تبلیغی جماعت میں زیادہ کشش محسوس ہوئی اور انہوں نے اپنی راہیں جدا کرلیں۔ لیکن یہ کام اتنی خاموشی سے ہوا کہ بہت کم لوگوں کو اس کی خبر ہوئی۔ بہت عرصے کے بعد انہوں نے اس اختلاف کا برملا اظہار کیا جو انکی جماعت سے علیحدگی کا سبب بنا۔ انکا خیال تھا کہ مولانا مودودی کی تعبیر دین میں سیاست کی طرف جھکاؤ اتنا بڑھ گیا ہے کہ اسکے نتیجے میں انسانی شخصیت میں ایک عدم توازن پیدا ہو گیا ہے۔ اس افراط کے باعث وہ شخصیت وجود میں نہیں آتی جو دین میں مطلوب ہے۔ انہوں نے اپنی اس رائے کا اظہار اپنی کتاب "عہد حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" میں کیا اس اختلاف کو بیان کرتے وقت انہوں نے مولانا مودودی کے علمی وقار اور دینی خدمات کا لحاظ رکھا اور کہیں بھی شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، مولانا مودودی کیساتھ احترام اور محبت کا تعلق مولانا کی وفات تک باقی رہا، مولانا مودودی کا معاملہ تو ایک طرف رہا۔ انکی شائستگی کا یہ عالم تھا کہ جب انہوں نے "قادیانیت" کے عنوان سے کتاب لکھی تو اسمیں غلام احمد قادیانی کا تذکرہ "غلام احمد قادیانی" کے الفاظ سے کیا بلاشبہ یہی ایک حقیقی داعی کی شان ہے وہ مناظرہ باز اور کج بحث نہیں ہوتا۔ اسکی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ مخاطب تک حق کی بات پہنچادے تاکہ وہ پلٹ آئے۔ وہ اسے صفحہ ہستی سے مٹانے کے درپے نہیں ہوتا۔

علمی اعتبار سے اگرچہ انہوں نے "تدبر قرآن" یا "تفہیم القرآن" جیسی کوئی یادگار نہیں چھوڑی لیکن اسکے باوجود انکا تحقیقی و تصنیفی کام اتنا وقیع ہے کہ بیسویں صدی کے مسلم فکر کے لئے ارتقاء کا جائزہ لیتے وقت اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ "نبی رحمت" کے ذکر جمیل سے لے کر

باقی ص ۶۴ پر دیکھیں